فیصل ریحان
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، گورنمنٹ انٹر کالج
برشور، بلوچستان

بلوچستان پر سرسیّد احمد خان کے اثرات

ABSTRACT

The influence of Sir Syed on Balochistan
By Faisal Rehan, Asst. Prof., Department of Urdu, Govt. Inter College, Barshor, Balochistan.

Balochistan is the largest province of Pakistan but is far behind as far as education and economy is concerned. The largest province of Pakistan is the smallest one when it comes to population. Many vast areas of Balochistan are either inhabited or are sparsely inhabited, with no human being seen for hundreds of kilometers. This has played a role in keeping the province way behind in education and economy since the lack of facilities hinder the efforts to improve. But it is quite strange that even a hundred and a fifty years ago Sir Syed Ahmed Khan had left some indelible marks on Balochistan and its people. This article shows how and why the impact of Sir Syed on Balochistan was profound.

بلوچستان پاک وہند کے مرکزی شہروں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ایک دور افتادہ خطہ ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر جنوبی ایشیا پر کی جانے والی سنجیدہ تحقیق وتنقید کے حاشیے پر بھی اس کا ذکر شاذ ہی ملتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان، برصغیر میں انگریزوں کا آخری مفتوحہ علاقہ ہے جو یہاں انیسویں صدی کے ربعِ آخر میں قابض ہوئے۔ انگریز کی آمد سے قبل یہاں جدید متمدن زندگی ناپید تھی۔ انگریزی قبضے کے بعد ہی بلوچستان میں کوئٹہ سمیت، کئی نئے شہر اور قصبے باقاعدہ منصوبہ بندی سے بسائے گئے، اور یوں جدید شہری زندگی کا آغاز ہوا۔ کوئٹہ اور گرد ونواح میں تعلیم وتربیت کی غرض سے اسکول کھولے گئے، ہسپتال بنائے گئے اور دیگر کارآمد سرکاری ادارے تعمیر ہوئے۔

اس مقالے کا موضوع یعنی ''بلوچستان پر سرسید احمد خان کے اثرات'' بہ ظاہر کچھ عجیب، اور بعید از قیاس لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید احمد خان (۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کبھی بلوچستان آئے نہ انھوں نے اپنی تحریر وتقریر میں بلوچستان کے حوالے سے کچھ کہا (واضح رہے علامہ اقبال نہ صرف بلوچستان آئے بلکہ انھوں نے بلوچستان کے بارے چند اہم باتیں کی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں)، یوں سوال اٹھتا ہے کہ پھر اس خطے یعنی

بلوچستان پر سر سید کے اثرات کا مطالعہ چہ معنی دارد؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ سر سید احمد خان کے تہذیبی ، سیاسی اور فکری اثرات اتنے ہمہ گیر اور وسیع ہیں، کہ ان سے برصغیر کا کوئی علاقہ بالخصوص کوئی مسلم علاقہ خالی نہیں؛ بلوچستان بھی ان میں سے ایک ہے۔ دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے اوائل میں پروان چڑھنے والی بلو چستان کی پہلی تعلیم یافتہ نسل کی ذہنی وفکری پرداخت پر سر سید احمد خان کے اتنے واضح مذہبی ،تہذیبی اور علمی و ادبی اثرات مرتب ہوئے جن سے انکار ممکن نہیں۔

بلوچستان کی پہلی تعلیم یافتہ نسل، جس نے سیاسی ، سماجی اور ادبی وعلمی ہر حوالے سے اپنے خطے میں رہنما کردار ادا کیا ہے ؛ان میں یوسف عزیز مگسی ،عبد الصمد خان اچکزئی ،گل خان نصیر ، غوث بخش بزنجو اور محمد امین کھوسہ ،محمد حسین عنقاوغیرہ شامل ہیں۔بلوچستان کے ان زعماء اور قائدین کی زندگی اور تحریروں کا سرسری مطالعہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں نے قیام پاکستان سے قبل اپنے خطے میں سیاسی، سماجی اور علمی حوالے سے جو جد وجہد کی (مثلاً جھل کے علاقے میں سکول کھولنا، مختلف اخبارات نکالنا اور دیگر ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیاں) ان پر سر سید احمد خان کے افکار اور تعلیمات کے بالواسطہ مگر نہایت گہرے اثرات ہیں۔ان میں سے کچھ لوگ مثلاً غوث بخش بزنجو،محمد امین کھوسہ اور سردار احمد گشکوری علی گڑھ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے رہے ۔یوسف عزیز مگسی اگرچہ علی گڑھ میں باقاعدہ طالب علم نہیں رہے، مگران کا علی گڑھ اپنے رفیق محمد امین کھوسہ کے پاس آنا جانا تھا،جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بلوچ سیاسی شعور کی علامت سمجھی جانے والی پہلی ''کل ہند بلوچ کانفرنس'' کے تصور نے علی گڑھ میں ہی جنم لیا تھا؛ یہ اقدام بلوچ قوم پرست سیاست کا نقطہ آغاز تھا، یہ کانفرنس ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو جیکب آباد میں منعقد ہوئی۔قیام پاکستان سے قبل بلوچستان میں تحریک پاکستان کے بعض رہنماؤں نے علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی تھی،اس سے ان لوگوں کا علی گڑھ سے تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ علی گڑھ کی سیاسی اور علمی فضا سے متاثر ہونے کی بنا پر ہی بلوچستان میں سرگرم کردار ادا کر سکے۔

اس تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے سے یہ امر بہ خوبی واضح ہو جائے گا،کہ جس طرح پاک و ہند کے دیگر علاقے سر سید احمد خان کی تعلیمات اور ان کے بنائے گئے ادارے علی گڑھ سے متاثر ہوئے، بالکل اسی طرح بیسویں صدی کے اولین نصف میں بلوچستان کی نوجوان نسل سر سید کے افکار اور نظریات سے فیض یاب ہوئی۔ان میں سے کئی لوگ، جن کے نام پہلے آ چکے ہیں، نہ صرف بلوچستان کی سیاست اور سماج میں نمایاں اور اہم مقام کے حامل ہیں بلکہ یہ لوگ اپنے ادبی اور علمی کارناموں کے باعث بھی ممتاز ہیں ۔آج بھی ان کی تحریریں بلوچستان میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور ان میں سے کئی شخصیات کو بلوچستان کے نوجوان آج بھی آئیڈیلائز کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ بلوچستان کی سیاست ، سماج اورادب پر سر سید احمد خان کے فکر ونظر کے اثرات اور اس کے ثمرات کا یہ پہلا تفصیلی مطالعہ ہے۔اس سے پہلے اس موضوع پر اس نوعیت کی تحقیق وتنقید نہیں کی گئی۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے سرسید احمد خان کبھی بلوچستان نہیں آئے تھے نہ ہی بلوچستان کی کسی اہم شخصیت سے ان کے مراسم یا رابطے کا حال ملتا ہے۔ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ آیا بلوچستان کا کوئی ایسا شخص نہیں جو سرسید کی زندگی میں ان سے ملا ہو، ان کی تقریر سنی ہو یا انھیں دور سے ہی دیکھا ہو۔ کیا کوئی ایسا شخص بھی تھا جس نے دہلی یا پنجاب میں سرسید کو دیکھا ہو یا ان سے ملا ہو اور پھر اس کے بعد وہ بلوچستان آیا ہو۔

سرسید کے سفرنامۂ پنجاب میں البتہ ایک ایسے شخص کی سرسید سے ملاقات کا تذکرہ ملتا ہے جو انھیں ملنے کی غرض سے ڈیرہ غازی خان سے امرتسر آیا تھا۔ سفر نامے میں مرقوم ہے کہ سید عبداللہ نامی اس شخص نے سرسید کو دعا دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''خدا تمھارے کاموں میں برکت دے اور ان کو حسبِ مراد پورا کرے۔''[1] ڈیرہ غازی خان اگرچہ اب پنجاب کا حصہ ہے اور یہ شاید تب بھی پنجاب کا حصہ تھا، مگر یہ علاقہ تاریخی طور پر بلوچستان کا حصہ شمار ہوتا ہے۔ آج بھی اس علاقے کی آبادی کا بڑا حصہ بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ سید عبداللہ نہ صرف سرسید کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں سے آگاہ تھے بلکہ ان کے حمایتی اور ان کی کامیابی کے لیے دعا گو بھی تھے۔ سرسید کو دہلی اور علی گڑھ سے بعض تعلیم یافتہ معاصرین اور علما کی جانب سے سخت مخالفت اور تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ اہلِ دہلی کے برعکس ایک دور دراز کے علاقے کا ایک شخص سرسید کی قومی خدمات کا قائل تھا۔ ڈیرہ غازی خان بلکہ ملتان تک سے بلوچستان کے باشعور اور تعلیم یافتہ طبقے کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اس سارے تناظر میں سید عبداللہ کے بارے جانکاری سے کئی نئی باتیں سامنے آسکتی ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر یعنی ۱۸۹۸ء میں جب سرسید نے وفات پائی، اس وقت بلوچستان کے دار الخلافہ کوئٹہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو نہ صرف سرسید کے علمی کارناموں سے آگاہ تھے، بلکہ وہ اس قومی سانحے کی شدت بھی محسوس کر سکتے تھے۔ سرسید کی وفات کے سوگوار موقع پر ۱۳ اپریل ۱۸۹۸ء کو کوئٹہ میں ان کی یاد میں ایک تقریب منعقد ہوئی اس میں سرسید کی فاتحہ خوانی بھی کی گئی اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا۔ راولپنڈی کے اخبار چودھویں صدی میں سرسید کے حوالے سے چھپنے والی اس خبر کا عنوان ''کوئٹہ میں اظہارِ ملال'' تھا۔ اس تقریب سے گفتگو کرتے ہوئے منشی عزیز الدین نے کہا تھا:

> قاعدہ ہے کہ اپنے کسی عزیز یا بزرگ کی وفات کی خبر سن کر پہلے پہل بہت رنج و غم ہوتا جاتا ہے مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے توں توں صدمہ کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور طبیعت سنبھلتی جاتی ہے لیکن میں تمھیں یاد دلاتا ہوں کہ یہ ایسا حادثہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، اس صدمۂ عظیم کا رنج و الم بڑھتا جائے گا اور یہ مصیبت، جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، زیادہ محسوس ہونے لگے گی۔[2]

محولہ بالا اقتباس سے جہاں سرسید کے انتقال کے سانحے پر کوئٹہ میں کیے گئے اظہارِ رنج کا پتہ چلتا ہے، وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان لوگوں کے طرزِ گفتگو یا تحریر پر سرسید کے اسلوب کے اثرات کتنے گہرے ہیں۔ شاید ان میں سے بعض لوگ علی گڑھ میں تعلیم پا چکے ہوں۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید احمد خان سے متاثر لوگ اس وقت کوئٹہ میں موجود تھے۔ اس موقع پر کوئٹہ میں سرسید احمد خان کی یادگار تعمیر کرنے کے لیے کوئٹہ و مضافات میں چندہ جمع کرنے کی اپیل کا فیصلہ بھی کیا گیا تھا اور سرسید کے فرزند، سید محمود کو تعزیت کا تار دیا گیا تھا۔ سرسید کی یادگار کے بارے میں بعد کی تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔(۳)

بلوچستان کا پہلا ادبی رسالہ قندیلِ خیال ۱۹۱۴ء میں لورالائی سے جاری ہوا، یہ قریباً دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس زمانے میں یہاں پریس موجود نہ تھا اس لیے یہ دہلی سے شائع ہوتا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے مطابق اس کے سرپرست عزیز الدین خاں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لورالائی تھے۔(۴) قیاس ہے کہ یہ وہی منشی عزیز الدین ہیں جنھوں نے سرسید کی وفات پر کوئٹہ میں تعزیتی تقریب سے گفتگو کی تھی اور جن کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔

بلوچستان کی پہلی تعلیم یافتہ نسل کا سرخیل یوسف عزیز مگسی کو قرار دیا جاتا ہے، وہ اپنے بعض رفقا کے برعکس علی گڑھ میں زیرِ تعلیم نہیں رہے۔ اس کے باوجود انھیں علی گڑھ سے ایک خاص نسبت اور عقیدت تھی اور ان کی علی گڑھ آمدورفت بھی تھی۔ ان کے خطوط میں بھی علی گڑھ آنے کا حال ملتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''۱۳ اپریل کو علی گڑھ پہنچوں گا۔''(۵) دوسری جگہ یوں مخاطب ہوتے ہیں۔ ''علی گڑھ آؤں گا، ضرور آؤں گا۔ کب؟ یہ میں بھی نہیں جانتا۔''(۶) یوسف عزیز کی نظر میں خوددار ہونا، بلوچ ہونا اور علیگ ہونا یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے دوست امین کھوسہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> مانا کہ تم غیور ہو، خوددار ہو، بلوچ ہو، علیگ ہو مگر آج یہ کیا انسانیت ہے کہ جواب تک سے جواب ہے۔(۷)

سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے جو مختلف ادارے قائم کیے تھے، ان میں سائنٹفک سوسائٹی ۱۸۶۴ء، علی گڑھ محمڈن ایسوسی ایشن ۱۸۸۳ء، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء، اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن شامل ہیں۔ عصمت اللہ خاں نے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے بارے جو بات کی ہے وہ سرسید کے قائم کردہ تمام اداروں پر صادق آتی ہے۔ عصمت اللہ خاں لکھتے ہیں:

> سائنٹفک سوسائٹی اور اس کے ترجمان علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے علمی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی معاملات میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کے اثرات و نتائج بڑے دور رس ثابت ہوئے۔ سوسائٹی کے طرز پر متعدد انجمنیں، سبھائیں اور ادارے وجود میں آ گئے اور ملکی سطح پر ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی جس میں ہندوستانیوں کو نئے

حالات کے تحت اپنے کردار کو سنوارنے اور زندگی میں حیات آفریں تبدیلیاں لانے کا موقع ملا۔(۸)

محولہ بالا اقتباس کو مدِنظر رکھا جائے تو بلوچستان میں بیسویں صدی کے اوائل میں جمہوری اور سیاسی حقوق کے لیے قائم ہونے والی انجمنوں کے ناموں اور ان کے مقاصد میں سر سید تحریک کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ بلوچستان میں قائم ہونے والی اس دور کی انجمنوں کے نام یوں ہیں۔ انجمنِ اسلامیہ ریاست قلات، انجمنِ اتحادِ بلوچاں، لوکل مسلم ایسوسی ایشن اورقلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی۔ ان تنظیموں کے ناموں پر سرسید تحریک کے اثرات ان کے ناموں سے واضح ہیں۔ یاد رہے کہ ہندوستان میں جدید قومیت کا تصور سب سے پہلے سر سید احمد خان نے دیا تھا۔ ان کی تحریروں میں 'قوم' کے ساتھ ساتھ لفظ 'نیشن' بھی انھی معنوں میں پہلی بار ملتا ہے۔ گویا قیامِ پاکستان سے قبل بلوچستان میں جمہوری اور سیاسی حقوق کے قائم ہونے والی انجمنیں علی گڑھ تحریک کی روایت میں ہی صورت پذیر ہوئی تھیں۔

بلوچستان کے سیاست دان اور مؤرخین اپنی تحریروں میں ایک تواتر سے اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ یوسف عزیز مگسی کا ایک کارنامہ یا قومی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے پہلی بار تمام ہندوستان کے بلوچوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کا سوچا، نہ صرف سوچا بلکہ اس کے لیے عملی جدو جہد کی۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے بالآخر دسمبر ۱۹۳۲ء میں جیکب آباد میں سہ روزہ ''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' منعقد ہوئی، جس کی صدارت یوسف عزیز مگسی کی درخواست پر پشتون رہنما عبدالصمد خان اچکزئی نے کی۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ یوسف عزیز کو اس ''کُل ہند بلوچ کانفرنس'' کا خیال اپنے قیام علی گڑھ کے زمانے میں آیا تھا۔ عبدالصمد درانی اس بابت لکھتے ہیں:

بلوچ کانفرنس کی تجویز نے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جنم لیا تھا، جہاں مرحوم نواب یوسف علی خان اپنے دیرینہ رفیق محمد امین کھوسہ سے ملنے گئے تھے۔(۹)

اسی طرح سر سید کی تتبع میں یوسف عزیز اور ان کے بعض رفقاء نے بلوچستان میں سیاسی شعور عام کرنے اور بلوچستان کے مختلف مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی اخبارات جاری کیے ان میں، البلوچ، بلوچستانِ جدید، ینگ بلوچستان اور استقلال وغیرہ معروف ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یوسف عزیز اور ان کے معاصرین نے سرسید احمد خان کی روشن خیالی اور ترقی پسندی (اس ترکیب کو بعد میں وہ مخصوص معنی دیے گئے جو آج مروج ہیں) سے گہرا اثر قبول کیا۔ جس طرح سرسید کی روشن خیالی مذہب سے جڑی ہوئی تھی اسی طرح ان حضرات کے ہاں بھی مذہب بے زاری نہیں ملتی۔ سرسید تحریک ان لوگوں کے لیے انسپائریشن کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر یوسف عزیز کے حوالے سے لکھتے ہیں:

جو سر سید کے خیالات اور ان کی اصلاحات ، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور

مولانا محمد علی جوہر کی تحریرات اور سیاسی نظریات سے اثر پذیر ہوئے تھے۔[۱۰]

یہ بات صرف یوسف عزیز کی شخصیت پر ہی صادق نہیں آتی، بلکہ ان کے تمام معاصرین اور فوراً بعد کے لوگوں پر پوری اترتی ہے، جو سرسید تحریک اور علامہ اقبال سے متاثر ہوئے۔ سرسید کے اثرات بلوچستان میں زبان و ادب، تعلیم و تربیت اور سیاست و صحافت کے شعبوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا اور ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ سرسید تحریک کے زیرِ اثر مادری یا علاقائی زبان نہ ہونے کے باوجود ان لوگوں نے اپنی ذاتی خط و کتابت، ادبی و علمی اور سیاسی و سماجی سرگرمیوں کے لیے اردو زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ اس طرح یہ لوگ اردو زبان کے اہم اور پرانے مراکز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ایک دور افتادہ خطے میں گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مصروف رہے۔ ان لوگوں کی تقلید میں بعد میں آنے والے لوگوں نے بلوچستان میں اردو ادب کی روایت کو پروان چڑھایا اور آج یہ بلوچی، براہوی، پشتو اور فارسی کی ادبی روایت کے مقابلے میں زیادہ ثروت مند ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں تخلیق ہونے والا ادب بلوچستان کی دیگر زبانوں کے مجموعی ادبی سرمائے سے مقدار و معیار میں زیادہ اور بہتر ہے۔ اس میں غیر مقامی اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے مقامی ادیبوں کا نہایت اہم کردار ہے۔ یوسف عزیز کے اسلوب اور طرزِ فکر پر سرسید تحریک کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، جو ان کے مکاتیب، مضامین اور شاعری کے سرسری مطالعے سے واضح نظر آتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> جس طرح کہ قدامت پرست رئیسوں کا شیوہ ہے کہ ہر ایک فائدہ بخش اور نفع رساں چیز سے جس کا حصول خاص کر فی زمانہ عزت اور آرام سے رہنے کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے باپ دادوں نے ایسا نہیں کیا۔'' ہماری اولاد کو ملازمت تھوڑی کرنی ہے۔ اسلاف کی روایات اور طرزِ معاشرت کے لیے انگریزی تعلیم مضر ہے، خطرناک ہے۔'' وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنی اولاد کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔[۱۱]

محولہ بالا اقتباس میں سرسید کا اسلوب تو صاف دکھتا ہی ہے، اس کا موضوع بھی وہی ہے جو سرسید اپنی تحریروں میں مسلسل زیرِ بحث لاتے رہے۔ اس عبارت کے ایک ایک لفظ اور اس کے استعمال کے قرینے پر طرزِ سرسید کی چھاپ اتنی نمایاں ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، حالانکہ یہ تحریر کسی مضمون کا حصہ نہیں بلکہ یہ یوسف عزیز مگسی کی ایک تمثیل ''تکمیلِ انسانیت'' کا بالکل ابتدائی حصہ ہے جسے بالعموم بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔

سرسید مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کا حصول مسلمانوں کی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ ان کی تحریر اور گفتگو میں دیگر اخلاقی و سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ ان دونوں پہلوؤں پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ مقالاتِ سرسید کی

مختلف جلدوں میں اس نوع کے مضامین ملتے ہیں مثلاً 'ہماری تعلیم ہماری زبان میں'، 'مسلمان اور تعلیمِ زبانِ انگریزی' اور 'ترغیبِ تعلیمِ انگریزی' وغیرہ۔ یوسف عزیز کی تمثیل 'تکمیلِ انسانیت' کے مرکزی کردار عزیز احمد (یہی اس کا نام ہے) کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ:

''اُسے اگر افسوس تھا، ہاں نا قابلِ تشریح افسوس تو عدم حصول تعلیم انگریزی کا۔''

اس ایک سطر سے یوسف عزیز مگسی بہ طور مصنف، انگریزی زبان کی تعلیم کے بارے، سر سید کے خیالات کے اسیر نظر آتے ہیں؛ یعنی یوسف بھی سر سید کی مانند ترقی کے لیے انگریزی کو ایک لازمی امر سمجھتے ہیں۔ فکرِ سر سید کے خوشہ چیں ہونے کے ساتھ ساتھ یوسف عزیز عملی طور پر بھی ان کے پیرو کار نظر آتے ہیں۔ سر سید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی جو بعد ازاں یونیورسٹی بن گئی، اور آج اس کا شمار پاک و ہند کی اہم جامعات میں ہوتا ہے۔ یوسف عزیز مگسی نے اپنے لوگوں کی بہتری اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر اپنے علاقے جھل مگسی میں ایک سکول کی بنیاد رکھی اور اسے 'جامعہ یوسفیہ' کا نام دیا۔ 'جامعہ یوسفیہ' بھی علی گڑھ کی طرح بلوچستان کا پہلا اقامتی ادارہ تھا جو بدقسمتی سے زیادہ عرصہ نہ چل سکا، اور ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے ہولناک زلزلے میں یوسف عزیز کی ناگہانی وفات کے کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، سر سید تحریک نے بلوچستان میں صرف یوسف عزیز مگسی کو ہی متاثر نہیں کیا، بلکہ ان کے رفقاء اور معاصرین کو بھی یکساں متاثر ہوئے۔ ایسا ہی ایک نام میر گل خاں نصیر (۱۹۱۴۔ ۱۹۸۳ء) کا ہے۔ گل خان نصیر بلوچی کے نامور شاعر ہی نہیں، نقاد، مورخ اور اہم سیاستدان بھی تھے۔ انھیں بلوچی کا 'ملک الشعراء' کہا جاتا ہے۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ گل خاں نصیر ابتدا میں اردو میں شعر کہتے رہے ہیں۔ ان کی اردو شاعری پر اقبال اور حالی کے اثرات صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''میرے دیس کے نوجوان سو رہے ہیں'' سے دو بند ملاحظہ ہوں:

'گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے'
فضا پے بہ پے آگ برسا رہی ہے
جہنم کی صورت نظر آ رہی ہے
غلامی ستم پر ستم ڈھا رہی ہے
گلستان نذرِ خزاں ہو رہے ہیں
مرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں

نہ اہلِ وطن کی تباہی کا دکھ ہے
نہ کھوئی ہوئی بادشاہی کا دکھ ہے

نہ دردر کی ٹھوکر گدائی کا دکھ ہے
نہ افلاس کا، بے نوائی کا دکھ ہے
پڑے خواب میں، نقدِ جاں کھو رہے ہیں
مرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں (۱۴)

اس نظم کی ابتدا حالی کے ہی ایک مصرعے سے ہوتی ہے، اور اس کا اسلوب، لفظ اور مصرعے کی سطح پر طرزِ حالی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج گل خاں نصیر کی پہچان بلوچی کے سب سے بڑے انقلابی شاعر کے طور پر مسلم ہے۔ سر سید کے اثرات بیسویں صدی کے بلوچستانی ادیبوں اور اور سیاسی اکابرین تک ہی محدود نہیں، آج کے بعض لکھنے والوں کے ہاں بھی سر سید کا اسلوب اپنی چھب دکھاتا ہے۔ سویلزیشن کا لفظ اسی املا میں پہلے پہل سر سید نے ہی تہذیب وتمدن کے معانی میں برتا، یہ ان کی مختلف تحریروں میں نظر آتا ہے، اور شاید ان کے ایک آدھ مضمون کا عنوان بھی ہے۔ اب ذرا بلوچستان کے آج کے ایک ادیب کا جملہ دیکھئے جو اپنی ایک کتاب کے پیش لفظ کا آغاز یوں کرتے ہیں:

''سولائزیشن کے جس مقام پہ ہم آج سانس لے رہے ہیں، وہ بے شمار پاک
انسانوں کے قتل کردہ ارمانوں کے کندھوں پہ استوار ہے۔''

کیا اس جملے پر سر سید کے اثرات کے حوالے سے کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ یہ کتاب ابھی حال ہی میں یعنی ۲۰۱۶ء میں طبع ہوئی ہے۔

غوث بخش بزنجو کو بلوچستان کی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کرنے کی وجہ سے ''بابائے بلوچستان'' کہا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت پاکستان کے مرکزی دھارے کے اہم سیاست دانوں میں بھی ممتاز ہے۔ اور اپنی ایک الگ اور منفرد پہچان رکھتی ہے۔ وہ سیاست میں رواداری اور عدم تشدد کے پرچارک تھے، اپنے اس مفاہمتی کردار کے باعث انھیں طنزاً ''بابائے مذاکرات'' بھی کہا گیا۔ بلوچستان میں بھی بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ غوث بخش بزنجو، علی گڑھ میں باقاعدہ طالب علم رہے ہیں اور اس طرح وہ بھی علیگ تھے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ انھیں علی گڑھ لے جانے والا کوئی اور نہیں، اس ادارے کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین تھے۔ بزنجو نوجوانی میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور 'غوثی' کہلاتے تھے۔ کراچی میں ایک بار علی گڑھ کی فٹ بال ٹیم کی مخالفت میں کھیلتے ہوئے انھوں نے عمدہ کھیل پیش کیا جس کی بنا پر انھیں علی گڑھ ٹیم کے لیے فٹ بال کھیلنے کی آفر کی گئی اور پھر انھیں پڑھنے کی غرض سے علیگڑھ لے جایا گیا، جہاں وہ کم وبیش چار سال تک طالبعلم رہے۔ اب یہ ہونہیں سکتا کہ علی گڑھ کا طالب علم، علی گڑھ کے اثرات سے بچ سکے؛ بزنجو نے کھیل میں تمام تر دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی اور وہاں کے ترقی پسند اور روشن خیال حلقے سے روشن خیالی اور رواداری کا سبق بھی لیا۔ علی گڑھ کی ترقی پسند روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> مرحوم سر سید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا، اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔(۱۷)

محولہ بالا اقتباس کو مدِنظر رکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ابھرنے والی بلوچستان کی ادبی ،علمی اور سیاسی شخصیات، سر سید تحریک کے زیرِ اثر ترقی پسندی اور روشن خیالی کی طرف مائل ہوئیں، ان پر ماسکو کے زیرِ اثر سامنے آنے والی ترقی پسند تحریک کا ٹھپہ لگا نا درست نہیں، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے ترقی پسند حلقے ، تاریخ میں کبھی مرکزی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ طور پر نہ جُڑ سکے ۔اہم بات یہ ہے کہ سر سید کی مانند بلوچستان کے ترقی پسند اور روشن خیال حلقے میں بھی مذہب بیزاری کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔

سر سید تحریک کے زیرِ اثر ہی بلوچستان میں تاریخ اور سوانح نگاری پر زیادہ توجہ دی گئی، جو لوگ اوّل اوّل ان میدانوں میں ابھرے، وہ تمام سر سید کے معترف، عقیدت منداور یا پھر علی گڑھ میں زیر تربیت رہے ہیں۔ ایسے لوگوں میں انور رومان، انعام الحق کوثر، سعید احمد رفیق، سردار خان بلوچ اور دیگر بہت سارے اہلِ قلم شامل ہیں۔ انگریزی کی کئی تاریخی کتب کے اردو تراجم بھی ہوئے اور کچھ لوگوں نے انگریزی کو وسیلہ ء اظہار بھی بنایا۔ انگریزی زبان میں بلوچستان کی تاریخ اور ادبی تاریخ پر اپنی کتب کے حوالے سے اندرون وبیرونِ ملک پہچانے جانے والے سردار خان بلوچ بھی علیگ تھے۔

قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں مقامی اور غیر مقامی حضرات کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے، جو علی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر شہروں میں ادبی، علمی اور سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہیں۔ اس مختصر مقالے میں ان تمام لوگوں کی ادبی وعلمی خدمات اور ان پر سر سید تحریک کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ ممکن نہیں، یہ ایک مفصل کتاب کا موضوع ہے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ نسل در نسل سر سید تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھنے کے باوجود بلوچستان کے بعض اہلِ قلم نہ صرف سر سید کے اثرات کے قائل نہیں، بلکہ وہ مختلف حوالوں سے سر سید پر معترض رہتے ہیں۔ بلوچستان میں سر سید احمد خان کی مخالفت کس طور رہی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے۔ شاہ محمد مری لکھتے ہیں:

> اب جب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ لا ابالی میں بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ 'بلوچستانیت' کے جذبات میں 'سرشار' ہو کر میں بھی سر سید احمد خان

کے خلاف 'بہت' بولا ہوں۔ اب مجھے اس پر پشیمانی ہوتی ہے۔(۱۸)

یہ شاہ محمد مری کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انھوں نے سر سید کے حوالے سے نہ صرف اپنے موقف سے رجوع کیا، بلکہ کھلے عام اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر ندامت کا اظہار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خان کی ہمہ جہت شخصیت کے بلوچستان کے اہلِ قلم و سیاست پر اس قدر واضح اور ہمہ گیر اثرات ہیں، جن سے انکار ممکن نہیں۔ سر سید کے افکار و تعلیمات نے ہندوستان بھر کے ساتھ ساتھ اہلِ بلوچستان کے قلب و ذہن کو بھی گرمایا اور انھیں جرأت کے ساتھ نئے راستوں پر چلنے کا ہنر سکھایا۔ سر سید کے پیروکار بھی ان کی مانند مختلف علوم و فنون میں بیک وقت سرگرمِ عمل رہے اور انھوں نے مختلف میدانوں میں اہم کارنامے انجام دیے، جو تاریخِ بلوچستان کے صفحات پر نقش ہیں۔

حواشی:

(۱) سر سید احمد خان، سفر نامۂ پنجاب، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۱ء)، بار دوم، ص ۱۷۸

(۲) ڈاکٹر گوہر نوشاہی (مرتب)، یادگارِ سر سید، (اسلام آباد: مجلسِ فروغِ تحقیق، ۱۹۹۶ء)، ص ۷۷

(۳) حال ہی میں انجمن ترقی اردو، کراچی کے ماہنامے قومی زبان کی اگست ۲۰۱۷ء کی اشاعت میں کوئٹہ کے مرحوم ادیب اور صحافی امداد نظامی کا ایک باقی ماندہ مضمون بعنوان بلوچستان میں قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کی یادگاریں شائع ہوا۔ اس میں کوئٹہ میں تعمیر شدہ کئی یادگاروں کا حال ہے مگر سر سید کی کسی یادگار کا تذکرہ اس میں نہیں ملتا۔

(۴) ڈاکٹر انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، (اسلام آباد: مقتدرہ اردو زبان، ۱۹۹۴ء)، بار دوم، ص ۶۱

(۵) ایضاً، مکاتیب یوسف عزیز مگسی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء)، ص ۴۴

(۶) ایضاً، ص ۶۴

(۷) ایضاً، ص ۶۲

(۸) محمد اکرام چغتائی (مرتب)، مطالعۂ سر سید، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۱۸

(۹) دیکھیے مقدمہ مکاتیب یوسف عزیز مگسی، ص ۵

(۱۰) ایضاً، ص ۲

(۱۱) یوسف عزیز مگسی، تکمیلِ انسانیت، (کوئٹہ: یونی ورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۷ء)، ص ۴

تکمیلِ انسانیت ایک تمثیل نما افسانہ ہے، اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یوسف عزیز نے اس میں خود اپنی ذات اور اپنے حالات کو موضوع بنایا ہے اور اسے افسانہ کے طور پر پہلی بار ۱۹۳۴ء میں اپنے اخبار بلوچستان جدید میں شائع کیا تھا۔ اس کا مکمل متن تب سے اب تک نایاب رہا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب بلوچستان میں اردو میں اس کا ذکر ملتا ہے اور ایک مختصر اقتباس بھی۔ گویا انھوں نے اسے نہ صرف دیکھا بلکہ اپنے تئیں اسے بلوچستان میں

اردو کا پہلا افسانہ بھی قرار دیا۔ان کی بات پر صاد کرتے ہوئے اسے بلوچستان کے ناقدین بنا دیکھے افسانہ قرار دیتے رہے۔ ابھی حال ہی میں اس کا مکمل متن دستیاب ہوا ہے۔ جسے شاہ محمد مری نے یوسف عزیز مگسی چیئر، یونی ورسٹی آف بلوچستان کے تحت، کوئٹہ سے الگ کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔ اپنے اسلوب اور مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی کے باعث یہ تحریر جدید افسانے کی تعریف پر پورا نہیں اترتی۔

(۱۲) دیکھیے مقالاتِ سرسید، (مرتب) مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، حصہ ہشتم و حصہ دو از دہم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۱ء و ۱۹۹۳ء بالترتیب)

(۱۳) تکمیلِ انسانیت، ص ۵

(۱۴) گل خان نصیر، کارواں کے ساتھ، (کوئٹہ: مہر در پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۵۹۔۶۰

(۱۵) شاہ محمد مری، میر عبدالعزیز کرد، (کوئٹہ: سنگت پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۶

(۱۶) ایضاً، بابا بزنجو، (کوئٹہ: سنگت پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، بار سوم، ص ۱۱۶۔۱۱۷

(۱۷) خلیق احمد نظامی، سرسید کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے، (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۳ء)، ص ۳۰

(۱۸) شاہ محمد مری، بابا بزنجو، ص ۲۷

مآخذ:

۱۔ پانی پتی، مولانا محمد اسماعیل (مرتب)، مقالاتِ سرسید، حصہ ہشتم و حصہ دو از دہم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۱ء و ۱۹۹۳ء

۲۔ چغتائی، محمد اکرام (مرتب)، مطالعۂ سرسید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۳۔ خان، سرسید احمد، سفر نامۂ پنجاب، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۱ء، بار دوم

۴۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، بلوچستان میں اردو، اسلام آباد: مقتدرہ اردو زبان، ۱۹۹۴ء، بار دوم

۵۔ ایضاً، مکاتیب یوسف عزیز مگسی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء

۶۔ مری، شاہ محمد، میر عبدالعزیز کرد، کوئٹہ: سنگت پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء

۷۔ ایضاً، بابا بزنجو، کوئٹہ: سنگت پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، بار سوم

۸۔ مگسی، یوسف عزیز، تکمیلِ انسانیت، کوئٹہ: یونی ورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۷ء

۹۔ نصیر، گل خان، کارواں کے ساتھ، کوئٹہ: مہر در پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

۱۰۔ نظامی، خلیق احمد، سرسید کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۳ء

۱۱۔ نوشاہی، ڈاکٹر گوہر (مرتب)، یادگارِ سرسید، اسلام آباد: مجلسِ فروغِ تحقیق، ۱۹۹۶ء